مصنف: ڈاکٹر محمد حسین ذہبی
مترجم: ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

(۱)

صدرِ اوّل میں تفسیر قرآن کے مصادر

—— یہ مقالہ ادارہ علوم القرآن علی گڑھ کے ششماہی مجلّے "علوم القرآن" سے ماخوذ ہے ——

عہد اول میں حضرات صحابہ کرام قرآن مجید کی تفسیر کے لیے چار مصادر پر تکیہ کرتے تھے:

اول: قرآن کریم دوم: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سوم: اجتہاد اور استنباط کی صلاحیت و لیاقت

چہارم: یہود و نصاریٰ کے اہل کتاب

ان چاروں مصادر کی وضاحت و تشریح ضروری ہے جو ہم ذیل میں کر رہے ہیں:

مصدرِ اول: قرآن کریم

قرآن کریم پر غور و فکر کرنے والا شخص فوراً جان لے گا کہ قرآن مجید ایجاز و اطناب، اجمال و وضاحت، اطلاق و تقیید اور عام و خاص پر مشتمل ہے۔ جو بات ایک مقام پر مختصر ہے وہ دوسرے مقام پر مفصل بیان کی گئی ہے۔ جو بات ایک جگہ مجمل ہے وہ دوسری جگہ واضح و مفصل کر دی گئی ہے اور اگر ایک بات کسی مقام پر کسی سبب سے مطلق آئی ہے تو وہ دوسری جگہ شرط و قید سے مقید کر دی گئی ہے اور جو بات کسی آیت میں عام ہے وہ کسی دوسری آیت میں خاص کر دی گئی ہے۔

اس لیے جو شخص کتاب اللہ کی تفسیر کرنا چاہتا ہے اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ پہلے قرآن مجید پر خوب غور و فکر کرے، پھر اس میں جو بات مختلف مواقع پر بار بار کہی گئی ہے اس سے متعلق تمام آیات و احکام کو جمع کرے اور ایسی تمام آیات کا باہمی موازنہ کرے تاکہ مفصل آیات کی مدد سے مختصر و موجز آیات کی وضاحت کر سکے اور واضح و روشن آیات کی مدد سے مجمل آیات کی تشریح کر سکے، اور مطلق آیات کو مقید آیات پر اور عام آیات کو خاص آیات پر محمول کر سکے اس طرح وہ قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم سے کر سکے گا اور سچ بات یہ ہے کہ اللہ کے کلام کو اور اس کی

مراد کو اسی کے کلام سے ہی پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اور یہ وہ مرحلۂ تفسیر ہے جس سے کسی مفسر کو مفر اور جائے اعراض نہیں اور یہی مرحلہ اسے دوسرے مرحلہ کی جانب قدم بقدم لے جا سکتا ہے۔ کیونکہ صاحب کلام ہی اپنے کلام کے معانی کو دوسروں سے بہتر اور زیادہ عمدہ طریقہ سے جانتا ہے اور غیروں کے مقابلے میں ان سے زیادہ واقف ہوتا ہے۔

اس طریقہ سے قرآن مجید کی قرآن مجید کے ذریعہ تفسیر کے باب میں مفسر اُن مختصر آیاتِ قرآنی کی تشریح کرے جو دوسرے مقام پر کھول کر اور مفصل طور سے بیان کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت آدمؑ اور ابلیس کا قصہ۔ وہ بعض مواقع پر مختصراً بیان ہوا ہے اور بعض دوسرے مقامات پر کافی مفصل اور مشرح آیا ہے۔ اور اسی طرح حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ ہے جو بعض مقامات پر تو مختصر طور سے بیان ہوا ہے۔ اور بعض دوسرے مقام پر کافی تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔

قرآن کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کی ایک صورت یہ ہے کہ مجمل آیات کو واضح و مبین آیات پر محمول کر کے مفسر ان کی تفسیر کرے۔ قرآن کریم میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ایک مثال سورہ مومن کی آیت ۲۸ میں اللہ تعالیٰ کا قول ہے: وَإِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ (اگر وہ سچا ہوگا تو تم پر پڑے گا کوئی وعدہ جو دیتا ہے) اس سے مراد دنیا کا جلدی اور فوری عذاب ہے کیونکہ اسی سورت کی آخر میں ایک آیت ۷۷ میں فرمان الٰہی ہے: فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ (پھر اگر دکھادیں ہم تجھ کو کوئی وعدہ جو ان کو دیتے ہیں یا پھیر لیں تجھ کو پھر ہماری طرف پھیرے آویں گے) اور اسی نوع کی تفسیر کی مثال سورہ نساء کی آیت ۲۷ میں اللہ تعالیٰ کا قول ہے: وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوَاتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا (اور جو لوگ لگے ہیں اپنے مزوں کے پیچھے وہ چاہتے ہیں کہ تم مڑ جاؤ راہ سے بہت دور) اس میں اہل کتاب سے خطاب ہے کیونکہ اسی سورت کی آیت ۴۴ میں ارشاد الٰہی ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ (تو نے نہ دیکھا جن کو ملا ہے کچھ ایک حصہ کتاب سے۔ خریدتے ہیں گمراہی اور چاہتے ہیں کہ تم بھی بھٹکو راہ سے) اس کی ایک اور مثال اللہ تعالیٰ کا قول سورہ بقرہ کی آیت ۳۷ میں ہے: فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے کئی باتیں)۔ اس کی تفسیر سورہ اعراف کی آیت ۲۳ کرتی ہے جو یہ ہے قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (بولے: اے رب ہمارے! ہم نے خراب کیا اپنی جان کو اور

اگر تو نہ بخشے ہم کو اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ہو جاویں نامراد) اسی قسم کی تفسیر میں اللہ تعالیٰ کا وہ قول آیا ہے جو سورہ انعام کی آیت ۱۰۳ میں آیا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (اس کو نہیں پا سکتیں آنکھیں) اور اس کی تفسیر سورہ قیامہ کی آیت ۲۳ کرتی ہے: إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (اپنے رب کی طرف دیکھتے)۔ اسی ذیل میں اللہ تعالیٰ کا قول ہے جو سورہ مائدہ کی آیت ۱ میں ہے أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ (حلال ہوئے تم کو چوپائے مواشی اس کے سوا جو تم کو سناویں گے) اور اس کی تفسیر اسی سورت کی آیت ۳ کرتی ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (حرام ہوا تم پر مردہ)

قرآن کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کی منجملہ اقسام میں سے ایک مطلق کا مقید پر اور عام کا خاص پر محمول کرنا ہے۔ اول الذکر قسم تفسیر کی مثال امام غزالی کی وہ روایت ہے جس کے مطابق اکثر شافعی علماء کا یہ مسلک ہے کہ اگر سبب متحد ہو مگر دو مقامات پر دو احکام میں اختلاف ہو تو مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا اور اس کی مثال و نظیر وہ وضو اور تیمم سے لاتے ہیں کہ وضو میں ہاتھوں کی تقیید کہنی سے کی گئی ہے جو سورہ مائدہ کی آیت ۶ میں موجود ہے۔ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ (تو دھولو اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک) جبکہ تیمم کے لیے اسی آیت میں ان کو مطلق بیان کیا گیا ہے: فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ (اور مل لو اپنے منہ اور ہاتھ اس سے) چنانچہ ہاتھوں کو تیمم کے باب میں کہنی تک مقید کر دیا گیا۔[۱] بعض علماء کے نزدیک اس قسم کی تفسیر کی مثال آیات ظہار و قتل ہیں ظہار کے کفارہ کے لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان سورہ مجادلہ کی آیت ۳ میں ہے۔ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ (تو آزاد کرنا ایک بردہ) اور قتل کے کفارہ کے لیے سورہ نساء کی آیت ۹۲ میں حکم الٰہی ہے: فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (تو آزاد کرے گردن ایک مسلمان کی) اس طرح پہلی آیت کے مطلق حکم کو دوسری آیت کے مقید حکم پر محمول کیا جائے گا۔ اور ایسا محض اس لیے کیا جائے گا کہ دوسری آیت میں مقید لفظ آگیا ہے اور جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے کسی اور جامع لفظ کی ضرورت حکم مطلق کو حکم مقید بنانے کے لیے نہیں پڑے گی۔[۲]

دوسری نوع تفسیر یعنی عام کو خاص پر محمول کرنے کی مثال ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک قول میں اپنی ذات سے دوستی اور شفاعت غیر اللہ کی قبولیت کی عام طور سے نفی کر دی ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا

شَفَاعَۃٌ وَالْکَافِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (اے ایمان والو خرچ کرو کچھ ہمارا دیا، پہلے اس دن کے آنے سے جس میں نہ بکنا ہے نہ آشنائی ہے نہ سفارش۔ اور جو منکر ہیں وہی ہیں گناہ گار) مگر اپنے دوسرے قول میں اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کی دوستی کو عام نفی کے اصول سے مستثنیٰ کر دیا ہے: اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ (جتنے دوست ہیں اس دن دشمن ہوں گے مگر جو ہیں ڈر والے) اسی کی مانند اذن الٰہی سے شفاعت کرنے والوں کو عام اصول سے مستثنیٰ قرار دیا ہے: وَکَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُھُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰہُ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیَرْضٰی (اور بہت فرشتے ہیں آسمانوں میں کام نہیں آتی ان کی سفارش کچھ مگر جب حکم دے اللہ جس کے واسطے چاہے اور پسند کرے) اس کی ایک اور مثال اللہ تعالیٰ کا قول ہے: مَنْ یَّعْمَلْ سُوْءًا یُّجْزَبِہٖ (جو کوئی برا کرے گا اس کی سزا پائے گا) اس آیت میں جو حکم عام ہے وہ اس کے فرمان: وَمَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ (اور جو پڑی تم پر کوئی سختی سو بدلہ اس کا کمایا تمہارے ہاتھوں نے اور معاف کرتا ہے بہت) سے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

قرآن کریم کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کے ذیل میں وہ آیات بھی آتی ہیں جن کے بارے میں یہ گمان ہے کہ وہ مختلف معانی بیان کرتی ہیں یا آپس میں متضاد نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر بعض آیات میں حضرت آدمؑ کو تراب (مٹی) سے تخلیق کرنا بتایا گیا ہے تو دوسری آیات میں طین (مٹی) یا حماٍ مسنون (سنا گارا) ہے یا صلصال (کھنکھناتی مٹی) ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر ان مختلف مراحل تخلیق کا ہے جن سے حضرت آدم اپنی تخلیق کی ابتدا سے روح الٰہی پھونکے جانے تک گزرے تھے۔

قرآن کی قرآن کے ذریعہ تفسیر کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ آیات کی بعض قراتوں کو دوسری قراتوں پر محمول کیا جائے بعض قرائتیں اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے دوسری قراتوں سے مختلف ہیں لیکن معانی کے اعتبار سے یکساں و متحد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت میں "اَوْ یَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِّنْ ذَھَبٍ" (یا ہو جائے تجھ کو ایک گھر سونے کا) ہے جو مشہور و متداول قرأت اَوْ یَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ (یا ہو جائے تجھ کو ایک گھر سنہرا) میں موجود لفظ "زخرف" کی تشریح کرتی ہے۔ بعض قرائتیں اگرچہ لفظ اور معنی دونوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں تاہم ایک دوسرے کے لیے مراد و مقصود کو متعین کرتی ہے۔ مثال کے طور پر

اللہ تعالیٰ کا قول ہے: یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (اے ایمان والو جب اذان ہو نماز کی جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کی یاد کو) اس کی تفسیر دوسری قرآت: فَامْضُوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (اللہ کے ذکر کے لیے چل کر روانہ ہو) کرتی ہے۔ کیونکہ سعی کے معنی تیز رفتاری سے جانے کے ہیں اور اگرچہ ظاہر میں یہی لفظ آیت میں استعمال ہوا ہے تاہم اس سے مراد محض جانا ہے۔

بعض قراءتوں میں الفاظ کی کمی بیشی سے بھی اختلاف ہوتا ہے اور دونوں قراءتوں میں سے زیادہ الفاظ والی کم الفاظ والی قرارت کے اجمال کی تفصیل کرتی ہے۔ اس کی ایک مثال وہ قرأت ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی سے منسوب ہے: لَیْسَ عَلَیْکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ فِیْ مَوَاسِمِ الْحَجِّ (کچھ گناہ نہیں تم پر کہ تلاش کرو فضل اپنے رب سے حج کے دنوں میں) یہ قرأت دراصل دوسری متداول قرآت کی جس میں فاضل فقرہ "فی مواسم الحج" نہیں ہے کی تفسیر بیان کرتی ہے[۱۱] اس آیت میں موجود فاضل فقرے نے بعض لوگوں کے دلوں میں پائے جانے والے اس شبہ کا ازالہ کر دیا کہ حج کے بازاروں میں جانے اور لین دین کرنے سے حج میں کوئی حرج واقع ہوتا ہے۔ ایک قرأت جو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی سے منسوب ہے یہ ہے: وَاِنْ کَانَ رَجُلٌ یُّوْرَثُ کَلٰلَۃً اَوِ امْرَاَۃٌ وَّلَہٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ مِّنْ اُمٍّ فَلِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا السُّدُسُ (اور اگر جس مرد کی میراث ہے باپ بیٹا نہیں رکھتا یا عورت ہو اور اس کا ایک بھائی ہے یا بہن ہے تو دونوں میں ہر ایک کا چھٹا حصہ) اور یہ قرارت دراصل متداول و مشہور قرأت کی جس میں بھائی بہن کے رشتہ کی نوعیت کا ذکر نہیں ہے تفسیر بیان کرتی ہے۔

اس نوع کی قراءتوں کے بارے میں علماء کے خیالات مختلف ہیں۔ بعض متاخرین کا خیال ہے کہ وہ سب قرآن کریم کی ہی صورتیں ہیں جبکہ دوسروں کا خیال ہے کہ وہ قرآن کریم کا جزو نہیں ہیں بلکہ وہ تفسیر کی قبیل سے ہیں۔ اور یہی بات ٹھیک بھی ہے کیونکہ صحابہ کرام قرآن مجید کی تفسیر کیا کیا کرتے تھے اور قرآنی آیات کے پہلو بہ پہلو تفسیر بیان کرنے کے جواز کے بھی قائل تھے۔ مگر امتداد زمانہ کے سبب بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ مختلف قرأتیں دراصل قرآن مجید ہی کی مختلف صورتیں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئی ہیں اور آپ سے ان کو صحابہ کرام نے براہ راست روایت کیا ہے۔ البتہ یہ امر کہ مختلف قرأتیں تفسیر قرآن بالقرآن کے لیے ایک اہم مصدر و مرجع ہیں کی تصدیق حضرت مجاہد تابعی کی ایک روایت سے مزید ہوتی ہے جس میں ان کا یہ بیان منقول ہے کہ "اگر میں نے

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بہت سے سوالات کرنے سے قبل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت پڑھ لی ہوتی تو مجھے ان سے اکثر سوالات پوچھنے کی ضرورت نہ رہتی۔[۱۱]

مذکورہ بالا مثالیں قرآن کریم کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کی تھیں۔ دراصل وہ ایسی تفسیر ہے جس میں صحابہ کرام کو قرآن کریم کے بعض معانی سمجھنے کے لیے خود بھی رجوع کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اور یہ ایسا لایعنی کام نہیں جس کی بنیاد کسی غور وفکر پر نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ تفسیر ایسا کام ہے جو بہت زیادہ غور وفکر اور تدبر وتعقل پر مبنی ہے۔ کیونکہ مجمل کا واضح پر، مطلق کا مقید پر، عام کا خاص پر یا دو قرأتوں میں سے ایک کا دوسری پر محمول کرنا آسان کام نہیں کہ ہر انسان کے بس کی بات ہو بلکہ وہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جس کی معرفت خاص طور سے صرف صاحبانِ علم ونظر کو ہی حاصل ہوتی ہے۔

اس بنا پر ہم گولڈزیہر کی اس بات سے اتفاق کر سکتے ہیں جو اس نے اپنی کتاب "تفسیر قرآن کے اسلامی مذاہب" میں کہی ہے کہ "قرآن کی تفسیر کا پہلا مرحلہ اور وہ اولین تخم جس سے اس کی نشو ونما ہوئی دراصل خود قرآن اور اس کے نصوص میں مرتکز یا زیادہ واضح عبارت میں اس کی قرأتوں میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ان مختلف شکلوں میں ہم تفسیر کی اولین کوشش کا مطالعہ کر سکتے ہیں"[۱۲] یہ درست ہے کہ اور ہم اس کی اس بات سے اتفاق کر سکتے ہیں کہ تفسیر کا پہلا مرحلہ خود قرآن کریم ہی میں پایا جاتا ہے اور وہ اس معنی میں کہ اس کی متشابہ آیات کو محکم آیات کی جانب لوٹایا جائے اس کے مجمل کو اس کے واضح پر، اس کے عام کو اس کے خاص پر اور اس کے مطلق کو اس کے مقید پر محمول کیا جائے۔ جس طرح یہ پہلا تفسیری مرحلہ قرآن کریم کی بعض متواتر قراءتوں میں پایا جاتا تھا۔ البتہ جو غیر متواتر قراءتیں ہیں ان کی طرف رجوع نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قرآن کا حصہ نہیں قرار دی جا سکتیں۔ البتہ اگر ان کو نص قرآنی کی تفسیر سمجھ کر ان کی طرف رجوع کیا جائے تو ہم اس مسئلہ پر گولڈزیہر کی رائے سے اتفاق کر سکتے ہیں اگر اس سے اس کی مراد یہی ہے۔ لیکن ہم اس کی ان باتوں سے اتفاق نہیں کر سکتے جن میں وہ قرآن کریم میں رد وبدل اور تحریف کی طرف اشارہ کرتا ہے اور جن میں وہ مسلمانوں پر اتہام تراشی کرتا ہے کہ انھوں نے مختلف قرأتوں کو قبول کرنے میں تساہل سے کام لیا۔ اور یہ بات اس نے اپنی اسی کتاب کے پہلے اور دوسرے صفحے پر کہی ہے کہ "ان قرأتوں کے بارے میں مسلمانوں نے تسامح کیا ہے اور ان کا پوری طرح سے سب نے اعتراف بھی کیا ہے باوجود اس دعوے کے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو کلمہ کلمہ اور حرف حرف نازل کیا ہے اور یہ کہ وہ کلام جو لوح محفوظ میں ثبت وموجود ہے اور جو کلام فرشتہ رسول مختار

پر لے کر اتر ا ضروری ہے کہ دونوں ایک ہی طرح کے الفاظ اور ایک ہی شکل رکھتے ہوں"۔

اسی طرح ہم اس کی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتے جو اس نے صحابہ کرام کے بارے میں کہی ہے کہ انھوں نے ان تمام قرأتوں کو اپنی طرف سے ایجاد کر لیا تھا۔ اور اس طرح وہ ان کے کلام اللہ ہونے کی نفی کرتا ہے۔ اور اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسی لچر و لوچ دلیلوں سے کام لیتا ہے جن کا کل مدار صرف تخیلات واوہام پر ہے جن کو وہ سوچ لیتا ہے اور پھر ان کو حقائق مان لیتا ہے۔ یہ بات اس نے صفحہ ۶۷ پر کہی ہے اور اس سے پہلے یہ آیت کریمہ نقل کی ہے:
إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ (ہم نے تجھ کو بھیجا احوال بتانے والا اور خوشی اور ڈر سناتا تاکہ تم لوگ یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کی مدد کرو اور اس کا ادب کہو اور اس کی بڑائی صبح و شام) اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ بعض لوگوں نے لفظ تُعَزِّرُوهُ کو تُعَزِّزُوهُ (دونوں جگہ ز) پڑھا ہے جس کے معنی ہیں کہ تم اس کی عزت و شرف کا لحاظ کرتے ہو مشہور و متداول قرأت کے بجائے اس قرأت کو اختیار کرنے کے بارے میں میرا خیال ہے کہ گولڈزیہر یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسانی مساعدت وامداد کا انتظار رہتا ہے اور اسی لیے اس نے اس کی دعوت دی ہے یہ صحیح ہے کہ ان معانی و مفاہیم کی آیات قرآن کریم میں وارد ہوئی ہیں (جیسے سورہ حج آیت ۴۰، سورہ حجرات آیت ۷ اور سورہ حشر آیت ۸ وغیرہ) تاہم ان آیات میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ نصر (مدد) ہے جو ایک اخلاقی اور تہذیبی اساس پر مبنی ہے اور وہ لفظ عزر کی طرح کی تعبیر نہیں ہے۔ اور یہ کلمہ عبرانی لفظ "عزار" کا ہم معنی و ہم پلہ ہے اور لفظ عزر سے جو تعبیر ہو گی وہ ایک نازک تعبیر ہے جس کی بنیاد مادی مساعدت پر ہے"۔

اس مصنف نے اپنی عادت کے مطابق جو سمجھا بیان کر دیا اور حسب دستور اس کی کوئی دلیل نہیں دی۔ اور اس رائے کے اختیار کرنے میں اس کو عربوں کے اسالیب اور بلاغت میں ان کے طریقوں سے اس کی ناواقفیت نے راہ دکھائی ہے۔ کیونکہ عرب اللہ تعالیٰ کے قول (وتعزروہ) — زاء کے ساتھ — کو مادی نصرت کے معنی میں ہرگز نہیں سمجھتے بلکہ جوں ہی یہ کلمہ ان کی سماعت سے ٹکراتا ہے وہ جان لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے اپنے دین اور اپنے رسول کی مدد چاہتا ہے۔ اور قرآن کریم میں اس جیسی بہت سی عادتیں آئی ہیں۔ اور اس نے جو لفظ "نصر" اور لفظ "عزر" میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ اول الذکر لفظ میں مدد کا مفہوم ایک

تہذیبی اور اخلاقی اساس پر قائم ہے جبکہ موخر الذکر کا مادی مساعدت و امداد پر تو اس کا یہ خیال خام ہے۔ کیونکہ اس خیال کا کسی بھی لغوی تفقہ پر مدار نہیں ہے۔

اسی کتاب کے صفحات انیس بیس پر مصنف مذکور کا بیان ہے کہ "میں چاہتا ہوں کہ ان قرأتوں میں سے جن کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض کو ذرا اہتمام کے ساتھ بیان کروں کیونکہ اس میں بعض بنیادی وجوہری اصولوں کی چھاپ ہے۔ ان اختلافات میں سے بعض کا سبب یہ خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جانب بعض ایسی عبارتیں منسوب کی جائیں جن میں بعض صاحبان نظر کو ذات الٰہی عالی یا رسول اکرم کی ذات پر حرف گیری نظر آتی ہے یا وہ ان کے شایان شان نہیں معلوم ہوتیں۔ چنانچہ ان تنزیہی افکار کے سبب قرأتوں میں اس پہلو سے بھی تغیر ہوا ہے۔" پھر اس نے اس کی مثالیں بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ "سورہ آل عمران کی آیت ۱۸: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ (اللہ نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا اور فرشتوں نے اور علم والوں نے) میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اللہ کی شہادت سے چونکہ مساوی سطح پر ملائکہ اور اہل علم کی شہادت متصادم ہوتی ہے اس لیے بعض لوگوں نے "شُهَدَاءُ اللّٰهِ" پڑھا اور اس طرح کلام سابقہ آیت: اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ شُهَدَاءُ اللّٰهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ (محنت اٹھانے والے اور سچے اور بندگی میں لگے رہنے اور خرچ کرنے اور گناہ بخشواتے پچھلی رات کو اللہ کے گواہی دینے والے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور ملائکہ اور علم والوں نے بھی) کے حسب حال ہو جائے گا۔

حالانکہ غور کرنے والا معمولی غور وفکر سے سمجھ لے گا کہ وہ خیال جس کا پہلی قرأت سے حاصل ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے کسی بھی عقل مند کی سمجھ میں نہیں آسکتا اور کسی طرح ممکن نہیں اور ہمارے خیال میں علماء میں سے کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ مفہوم نہ آیا ہوگا۔ پس ملائکہ کے ساتھ اللہ کی شہادت میں کوئی خرابی نہیں اور اس سے یہ معنی ہرگز نہیں نکلے کہ جن کا ذکر اللہ کے ساتھ کیا گیا ہے وہ اس کے مساوی یا برابر ہیں۔

صفحات اکیس اور بائیس پر وہ کہتا ہے کہ سورہ عنکبوت میں آیات ۲ و ۳ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (کیا یہ سمجھے نہیں لوگ کہ چھوٹ جائیں گے اتنا کہہ کر کہ ہم

یقین لائے اور ان کو جانچ نہ لیں گے اور ہم نے جانچا ہے ان کو جو ان سے پہلے تھے سو اللہ معلوم کرے گا جو سچے ہیں اور معلوم کرے گا جھوٹوں کو" میں اللہ تعالیٰ کے قول "فَلَيَعْلَمَنَّ" (اور معلوم کرے گا) کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس کی جانب یہ وحی کی کہ اس کی آزمائش وفتنہ کے وقت اس بات کا علم ہوا گویا کہ وہ اس کو ازل سے نہیں جانتا تھا اور وہ یہ ظاہر کرتا ہے اسی قسم کے گمان نے حضرت علیؓ اور حضرت زہری کو اس لفظ کو باب اعلام سے فَلَيُعْلِمَنَّ (اور جتا رہے گا / واقف کرادے گا) پڑھا جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے اخلاق سے تمام لوگوں کو آگاہ وخبردار کردے گا۔ یا اس معنی میں کہ وہ ان کی ایسی نشانیاں دکھادے گا کہ وہ ان کے چہروں کی سفیدی یا سیاہی کے سبب یا آنکھوں کی سیاہی یا نیلے پن کے سبب پہچان لیے جائیں گے۔ اور عربوں کے نزدیک آنکھوں کا نیلا پن بدنامی اور غداری اور کبھی کبھی حسد کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

اس کی تردید میں ہم یہ کہتے ہیں کہ بلاریب اللہ تعالیٰ کسی شے کی موجودگی سے اس کے وجود کے بعد ہی واقف ہوتا ہے چنانچہ اس کے علم کا تعلق حادث سے اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ کون واقعہ ہوا۔ اور اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اس چیز کے وقوع وجود سے قبل ازل سے اس کو نہیں جانتا تھا مصنف مذکور نے یہ سمجھ لیا کہ فتنہ کے سبب وجود میں آنے والا علم، علم ازلی ہے اور وہ یہ حقیقت بھول گیا کہ دراصل وہ انکشاف وظہور کا علم ہے چنانچہ اس سبب سے یہ تصور کرلیا کہ جن لوگوں نے "فلیعلمن" کو باب اعلام سے پڑھا ہے انھوں نے اس کو اس لیے پڑھا کہ وہ پہلی قراءت سے حاصل شدہ معانی سے گریز کرنا چاہتے ہیں اور یہ بالکل کھوٹ اور باطل دعویٰ ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام پر یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے فتنہ وآزمائش اس کے بندوں میں ہر شخص کے لیے ہوسکتی ہے جس کے بارے میں اس کی مشیت ہو اور اس سے مراد یہ ہے کہ خارجی طور سے وہ لوگوں کے سامنے اس کو ظاہر کردے جس کو وہ ازل سے جانتا تھا۔ چنانچہ یہ کیسے سمجھا جاسکتا ہے کہ انھوں نے محض اس خیال خام کے سبب باب علم سے فَلَيَعْلَمَنَّ کو باب پڑھنے سے گریز کرکے اسے باب اعلام سے فَلَيُعْلِمَنَّ پڑھنے کی قراءت اختیار کی ؟ خدا کی قسم مصنف کا مقصود ومنشا بس یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ذہن میں یہ وہم جمادے کہ صحابہ کرام نے قرآن کریم کو اپنی تحریف وتبدیل کے لیے تختۂ مشق بنالیا تھا۔

مصنف مذکور نے اپنی اس کتاب میں ایسی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ وہ سب کی سب اسی قبیل کی اور اسی غرض کی خاطر دی گئی ہیں اور اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قراءت

متواترہ اور قراءت شاذہ کے درمیان کوئی تفریق و امتیاز کیا جائے۔ اگر اسے علم ہوتا کہ مسلمانوں نے قراءت کی صحت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے تواتر کے ساتھ نقل کرنے اور قبول کرنے یا صحت اسنادا ور عربیت کے اصولوں سے موافقت اور خط عثمانی سے مطابقت کی کیا شرائط عائد کی ہیں تو وہ اس رائے باطل کو نہ اختیار کرتا۔ اور ہرگز ہرگز صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے حوالے سے ایسی کتاب کے بارے میں تحریف و تبدیلی کی نسبت نہ کرتا جس کی حفاظت و تحفظ کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی ہے: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (ہم نے آپ پر اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں)

مصدر دوم: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کتاب اللہ کی تفسیر کا مصدر دوم جس کی طرف صحابہ کرام رجوع کیا کرتے تھے وہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی۔ اگر ان میں سے کسی صحابی کو کتاب اللہ کی کسی آیت کے بارے میں کوئی اشکال پیش آتا تو وہ اس کی تفسیر کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا کرتا تھا اور آپ اس کے سامنے ہر اس چیز کی وضاحت و صراحت فرما دیتے جو اس پر نہ کھلتی تھی۔ کیونکہ شرح و بیان بھی آپ کا ایک فرض رسالت تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں اپنی کتاب عزیز میں بتایا ہے: وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَلَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ (اور تجھ کو اتاری ہم نے یہ یاد داشت کہ تو کھول دے لوگوں پاس جو اترا ان کی طرف اور شاید وہ دھیان کریں) اور جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا اور آپ کے اس فرمان کو امام ابوداؤد نے اپنی مرفوع سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ "جان لو کہ مجھے کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ اس جیسی چیز اور عطا ہوئی ہے۔ خبردار اور ہوشیار رہو کہ کوئی پیٹ بھر اشخص اپنے تخت پر بیٹھ کر یہ نہ کہے کہ تمہارے لیے صرف یہ قرآن ہی لازم و ضروری ہے اس میں جو تم کو حلال ملے اس کو حلال سمجھو اور اس میں جو حرام پاؤ اس کو حرام گردانو ... (یہ حدیث پوری آگے چل کر ہوتی ہے جس کا مطلب ولب لباب ہے کہ سنت رسول بھی وحی الٰہی ہی کی ایک قسم ہے اور اس کی اتباع بھی لازمی ہے۔ مترجم)

جو شخص بھی حدیث و سنت کی کتابوں کی طرف رجوع کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ ان کے مختلف ابواب میں ایک باب تفسیر بھی ہوتا ہے جو خاص طور سے باندھا جاتا ہے اور اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی بہت سے ماثور تفسیری نکات بھی بیان کیے جاتے

ہیں۔ اس کی متعدد مثالیں ذیل میں دی جا رہی ہیں :

(۱) امام احمد بن حنبل اور امام ترمذی وغیرہ نے حضرت عدی بن حیان سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مغضوب علیہم سے بلاشبہ یہود مراد ہیں اور الضالین سے نصاریٰ مراد ہیں۔"[۱۷]

(۲) امام ترمذی اور امام ابن حیان نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ الصلوٰۃ الوسطیٰ (بیچ کی نماز) سے مراد نماز عصر ہے۔[۱۸]

(۳) امام احمد بن حنبل اور حضرات شیخین یعنی امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب آیت کریمہ: الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم[۱۹] (جو لوگ ایمان لائے اور ملائی نہیں اپنے یقین میں کچھ تقصیر) نازل ہوئی تو وہ لوگوں پر بہت شاق گذری اور انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ، ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے آپ پر ظلم نہ کیا ہو؟ آپ نے فرمایا: اس کے وہ معنی نہیں ہیں جو تم مراد لیتے ہو۔ کیا تم نے مرد صالح کی یہ بات نہیں سنی کہ شرک بیشک بڑا ظلم ہے۔ اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے۔

(۴) امام مسلم وغیرہ نے حضرت عقبہ بن عامرؓ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برسر منبر آیت کریمہ: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ (اور سرانجام کرو ان کی لڑائی کو جو پیدا کر سکو زور) تلاوت کرتے سنی اور پھر آپ نے فرمایا: جان لو کہ قوت سے مراد رمی (تیر اندازی) ہے۔[۲۰]

(۵) امام ترمذی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حج اکبر کے دن کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس سے نحر (قربانی کا دن) مراد ہے۔

(۶) امام ترمذی اور امام ابن جریر طبری نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ آیت کریمہ: وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى (اور لگا رکھا ان کو ادب کی بات پر) سے مراد کلمہ لاالٰہ الا اللہ مراد ہے۔[۲۱]

(۷) امام احمد بن حنبل اور حضرات شیخین وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس سے لڑ جھگڑ کر حساب لیا گیا وہ عذاب میں گرفتار ہوا"۔ میں نے عرض کیا: کیا اللہ تعالیٰ نہیں فرماتا: فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا؟[۲۲] (تو اس سے حساب

لیتا ہے آسان حساب) آپ نے فرمایا: "حساب کتاب نہیں محض پیشی ہے۔"

(۸) امام احمد بن حنبل اور امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوثر ایک نہر ہے جو میرے رب نے مجھے جنت میں عطا فرمائی ہے۔" [۲۳]

مذکورہ بالا روایات کے علاوہ اور بہت سی صحیح تفاسیر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول و مروی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب من گھڑت تفسیری روایات

قصہ گو اور من گھڑت راویوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی من گھڑت اور جعلی روایات بھی منسوب کر دی ہیں اور آپ کی ذات گرامی کی طرف ان بعض روایات کی نسبت ہے جو آپ نے نہیں ارشاد فرمائیں۔ اس کی ایک مثال حاکم کی وہ روایت ہے جو انھوں نے حضرت انسؓ کی سند سے یوں بیان کی ہے: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ [۲۴] (ڈھیر جوڑے ہوئے) کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ قنطار ایک ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے [۲۵]

ایک دوسری مثال یہ ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل اور امام ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے [۲۶]

قنطار کے وزن کے بارے میں اس قسم کا تضاد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہی نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ علماء کرام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب اس قسم کی تمام روایات کو مسترد کر دیا ہے۔ اور ان کو بالکل ہی مردود قرار دیا ہے۔ امام احمد بن حنبل سے منقول ہے کہ "تین چیزیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل و بنیاد نہیں: تفسیر، ملاحم یا جنگیں اور مغازی۔" ان کے اس قول سے مراد یہ ہے جیسا کہ ان کے محقق مقلدین کا بیان ہے کہ ان تینوں اقسام علم کی بیشتر روایات میں صحیح اور متصل اسانید نہیں پائی جاتیں [۲۷] (یعنی ان میں سے اکثر و بیشتر روایت کے درجہ اور کسوٹی پر کھری نہیں اترتیں لہٰذا وہ قابل اعتبار و اعتنا نہیں ہیں) امام احمد بن حنبل کے اس مقولہ کا وہ مفہوم ہرگز نہیں ہے جو استاد احمد امین نے اپنی کتاب میں اختیار کیا ہے۔ استاد موصوف اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ تفسیر کے باب میں جتنی بھی احادیث نبویہ بیان ہوئی ہیں وہ سب کی سب بے بنیاد و بے اصل اور بے سند ہیں لہٰذا ان کی صحت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور ظاہر بات ہے کہ جیسا کہ امام احمد بن حنبل کے بعض مقلدوں نے کہا ہے کہ اس سے امام احمد

بن حنبل ان مرفوع احادیث کو مراد لیتے ہیں جن کی سند رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تک تفسیر کے باب میں پہونچائی گئی ہے۔ لیکن جہاں تک ان احادیث و آثار کا تعلق ہے جو صحابہ کرام اور تابعین عظام سے مروی و منقول ہیں تو ان سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ خود امام احمد نے بھی ان میں سے بعض کا اعتراف کیا ہے۔ استاذ احمد امین نے جہاں یہ کہا ہے کہ بعض علماء نے اس باب کا قطعی طور سے انکار کیا ہے اس سے میری مراد یہ ہے کہ انھوں نے اس باب میں وارد تمام روایات تفسیر کی صحت کا انکار کیا ہے چنانچہ امام احمد سے مروی ہی کہ انھوں نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں: تفسیر، ملاحم اور مغازی[۲۸]۔ تو استاد موصوف کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔

جی ہاں، ضحی الاسلام اور فجر الاسلام کے مصنف نے جو کچھ بیان و اظہار کیا ہے وہ صحیح تعبیر نہیں ہے۔ کیونکہ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تفسیر کے باب میں صحیح روایات بھی مروی ہیں اور خود امام احمد بن حنبل نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ یہ کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ سابقہ عبارت سے امام احمد نے تفسیر کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول تمام صحیح اور مرفوع روایات کی صحت سے انکار مراد لیا ہے؟ اور میرا خیال ہے کہ استاذ احمد امین نے مذکورہ بالا بعض حنبلی علماء سے امام احمد کے محققین اصحاب کو مراد لیا ہے اور بایان کار انھوں نے ان علماء حنابلہ کے کلام کا وہ مطلب نکال لیا جو ان کے نزدیک مقصود نہ تھا چنانچہ انھوں نے اس غلطی کا ارتکاب کیا اور زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ استاذ موصوف نے فجر الاسلام کے صفحہ ۲۴۵ کے حاشیہ میں اتقان سے جو کچھ نقل کیا ہے اس کو ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ امام احمد کے محقق اصحاب کا کلام ہے اور خود امام کا کلام نہیں ہے۔

استاذ احمد امین نے فجر الاسلام ص۲۴۵ اور ضحی الاسلام جلد دوم، ص۱۲۸ پر یہ اعتراف کیا ہے کہ قرآن کریم کے بعض مشکل مقامات کی تفسیریں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کے ساتھ مروی ہیں۔ اور اگرچہ ان کے کلام میں کافی الجھن و اضطراب ہے چنانچہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تفسیر کے باب میں مروی تفسیری روایات حد سے زیادہ بڑھا دی ہے۔ جیسا کہ انھوں نے فجر الاسلام ص۲۴۵ پر کہا ہے کہ "اس قسم کی روایات بہت زیادہ ہیں اور ان پر مشتمل ابواب صحاح ستہ کی کتابوں میں آئے ہیں اور ان میں قصہ گوؤں اور من گھڑت روایات بنانے والوں نے بہت سی روایات کا اضافہ کر دیا ہے[۲۹]۔ پھر ضحی الاسلام جلد دوم ص۱۲۸ میں انھوں نے دوبارہ یہی بات کہی، مگر اس بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات کی تعداد حد سے زیادہ گھٹا دی ہے چنانچہ فرماتے

ہیں کہ "اس باب میں جو کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اس کی مقدار بہت کم ہے حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض گنتی کی چند آیات قرآنی کی تفسیر بیان کی تھی جو آپ کو حضرت جبریل علیہ السلام نے سکھائی تھیں"۔ استاد موصوف کی نظر سے یہ حقیقت اوجھل رہ گئی کہ مذکورہ بالا حدیث میں کلام کیا گیا ہے اور وہ علماء رجال کے نزدیک مطعون ہے انھوں نے اس حدیث کو اپنے دعوے پر بطور دلیل کے پیش کیا ہے اور اس پر نقد بھی نہیں کیا ہے حالانکہ انھوں نے اس حدیث کو نقل کرنے کی ذمہ داری ڈالی ہے اور ان کا حوالہ دیا ہے جبکہ امام طبری نے اس کی علت بھی واضح کی ہے اور صحت کے فرض کرنے کی صورت میں اس کی تاویل بھی کی ہے جیسا کہ ہم بعد میں انشاء اللہ واضح کریں گے۔

کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن کی تشریح فرمائی ہے؟

ایک کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سورہ نحل آیت ۴۴ میں فرماتا ہے: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ اور ہم نے اتاری تم پر یہ یاد داشت کہ تو کھول دے لوگوں پاس جو اترا ان کی طرف اور شاید وہ دھیان کریں، تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے پورے قرآن کو واضح کر دیا تھا اور اس کے تمام مفردات و مرکبات کی تشریح فرما دی تھی اور اس کے ضمن میں جو احکام آئے ہیں کیا ان سب کو بھی بیان کر دیا تھا؟ یا آپ نے قرآن کریم کے بعض حصوں کی وضاحت فرمائی اور کچھ حصوں کے بارے میں سکوت فرمایا تھا؟ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے سامنے یہ بیان و تشریح کس انداز سے فرمائی تھی؟ ان سوالات کا جواب ذیل میں ہم دیتے ہیں

قرآن کریم کی وہ مقدار جس کی تفسیر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے لیے فرمائی

علماء کا اس امر پر اختلاف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام کے لیے قرآن مجید کا کتنا حصہ بیان فرمایا۔ ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ آپ نے اپنے صحابہ پر قرآن کریم کے تمام معانی اسی طرح واضح فرمائے جس طرح کہ اس کے الفاظ بیان فرمائے۔ ان علماء کرام کے سرخیل امام ابن تیمیہ ہیں[30]۔

مگر ان میں دوسرا طبقہ وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے سامنے قرآن مجید کے بہت کم معانی واضح کیے۔ ان طبقہ کے سرخیل الخوئی اور السیوطی ہیں[31] اور مختلف

ایک طبقہ نے اپنے اپنے دعوے کی حمایت وثبوت میں دلائل پیش کیے ہیں جن کا ہم ذیل میں جائزہ لیتے ہیں تاکہ سچ ظاہر ہوا اور حق پایۂ ثبوت کو پہونچے۔

پورے معانی قرآن کی نبوی تشریح کے قایل طبقہ کے دلائل

پہلی دلیل: اللہ تعالیٰ کا قول ہے: وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (اور تجھ کو اتاری ہم نے یہ یادداشت کہ تو کھول دے لوگوں کے پاس جو اترا ان کی طرف اور شاید وہ دھیان کریں) آیت کریمہ میں مذکورہ بیان کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے معانی بیان کیے جائیں جس طرح سے اس ست الفاظ کے بیان پر دلالت ہوتی ہے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تمام الفاظ بیان فرمائے اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ نے اس کے تمام معانی بھی بیان فرمائے تھے ورنہ بصورت دیگر آپ بیان وتشریح کے اس فریضہ میں کوتاہی کرنے والے قرار پائیں گے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ پر عائد کیا گیا تھا۔

دوسری دلیل: حضرت ابوعبدالرحمن سلمی رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: ہم سے ان حضرات نے بیان کیا جو ہم کو قرآن کریم کی تعلیم دیا کرتے تھے جیسے حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کہ جب وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات سیکھتے تھے تو ان سے اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک کہ ان آیات کریمہ میں موجود تمام علم کو سیکھ نہ لیتے اور ان کے احکام پر عمل نہ کرتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے قرآن کریم اور علم وعمل کو ساتھ ساتھ پورا سیکھا ہے۔' چنانچہ ان کو ایک سورت حفظ کرنے میں کافی مدت لگا کرتی تھی۔ امام مالک نے موطا میں بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے سورۂ بقرہ حفظ کرنے میں آٹھ برس لگائے۔ اور جس چیز نے صحابہ کرام کو اس محتاط انداز تعلیم پر آمادہ کیا تھا وہ یہ فرمان الٰہی ہے: كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوْا آيَاتِهٖ [۳۳] ایک کتاب ہے جو اتاری ہے ہم نے تیری طرف برکت کی تاکہ دھیان کریں لوگ اس کی باتیں) اور کلام پر تدبر کرنا اس کے معانی کو سیکھے بغیر ناممکن ہے۔ اور دوسرا فرمان الٰہی ہے: اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ [۳۴] (ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا کہ شاید تم بوجھو) اور کلام پر غور کرنا اس کے سمجھنے کو شامل ہے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر کلام کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ محض اس کے الفاظ کو نہ سمجھا جائے بلکہ اس کے معانی کو بھی جانا اور سمجھا جائے۔ اور قرآن کریم دوسرے کلاموں کے مقابلے میں اس بات کا زیادہ

استحقاق رکھتا ہے کہ اس کے الفاظ کے ساتھ اس کے معانی بھی سمجھے جائیں۔

یہ آثار صحابہ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کے تمام معانی سمجھے تھے جس طرح کہ انھوں نے اس کے الفاظ سیکھے تھے۔

تیسری دلیل: ان کا بیان ہے کہ عادت بشری اس سے انکار کرتی ہے کہ کوئی قوم علم کی کسی شاخ مثلاً طب یا حساب وغیرہ کی کوئی کتاب پڑھے اور اس کی تشریح نہ چاہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی کتاب کے بارے میں یہ کیسے ممکن ہے جس سے ان کی آخری پناہ ہے جس سے ان کی نجات وابستہ ہے اور جس کے سبب وہ دنیا و آخرت میں سعادت سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں؟

چوتھی دلیل: امام احمد بن حنبل اور امام ابن ماجہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا: قرآن کریم کے آخری نازل ہونے والے حصہ میں آیت ربا ہے۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تفسیر بیان فرمانے سے قبل ہی وفات پا گئے۔ یہ روایت بالواسطہ ہی سہی مگر یہ بتاتی ہے کہ آپ صحابہ کرام کے سامنے پورے نازل ہونے والے قرآن کی تفسیر کیا کرتے تھے اور آپ نے صرف اس آیت کی تفسیر نہیں بیان کی کیونکہ اس کے نزول کے فوراً بعد آپ کی وفات ہوگئی ورنہ اس آیت کریمہ کی تخصیص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔[۳۵]

تھوڑے معانی قرآن کی نبوی تفسیر کے قائل علماء کے دلائل

اس رائے کے حامل طبقہ کے دلائل حسب ذیل ہیں:

پہلی دلیل: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بزاز کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی محض گنتی کی چند آیات کی تفسیر بیان کی تھی جو ان کو حضرت جبریل نے سکھائی تھیں۔[۳۶]

دوسری دلیل: ان کا کہنا ہے کہ تمام معانی قرآن کا بیان کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ناممکن تھا اور وہ صرف چند آیات کے بارے میں ہی ممکن تھا اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اور مرادی معانی کا علم اشاروں اور دلیلوں کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریمؐ کو قرآن مجید کی تمام آیات کی مراد و معنی بتانے کا کوئی قطعی حکم نہیں دیا تھا تاکہ اس کے بندے اس کی کتاب پر غور و فکر کرتے رہا کریں۔[۳۷]

تیسری دلیل: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے تمام معانی کی تشریح و توضیح فرما دی ہوتی تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لیے آپ کی دعا کی کوئی تخصیص نہ رہ جاتی

جس میں آپ نے بارگاہ الٰہی میں التجا کی تھی کہ" اے اللہ اس کو دین کی سمجھ اور تاویل کا علم عطا کر" چنانچہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام معانی قرآن اپنے اصحاب پر واضح کردئے تھے تو وہ اس کی تاویل کی معرفت میں مساوی تھے تو اس دعا میں حضرت ابن عباس کے لیے کیا تخصیص کی بات رہ جاتی ہے[۳۵]

فریقین کا غلو

دونوں فریقین کے مذکورہ بالا دلائل پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ وہ دونوں اس باب میں افراط و تفریط کا شکار ہیں اور میرے خیال میں ان دونوں نے اپنی اپنی رائے میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور ہر فریق نے جن دلائل پر اپنی بات ثابت کرنے کے لیئے تکیہ کیا ہے ان پر کلام کیا جاسکتا ہے کہ وہ ان کی بات کو ثابت نہیں کرتے۔

فریق اول کے دلائل کا تجزیہ

امام ابن تیمیہ اور ان کے ہمنوا علماء نے اللہ تعالیٰ کے قول : لتبین للناس ما نزل الیہم (کہ تو کھول دے لوگوں پاس جو اترا ان کی طرف) سے جو استدلال کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس فرض منصبی کی بنا پر کہ آپ قرآن مجید کی تشریح و تعبیر کے لیے مامور تھے اپنے اصحاب کرام کے لیے قرآن مجید کے ان مقامات کی توضیح و تشریح فرماتے تھے جو ان کے لیے مشکل ہوتے تھے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ آپ تمام معانی قرآن بیان فرماتے خواہ وہ ان کے لیے مشکل ہوں یا آسان۔

اب رہا ان کا اس روایت سے استدلال جو حضرات عثمان و عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات سیکھتے تھے تو ان سے آگے اس وقت تک نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیات میں مذکور علم و عمل کو نہ سیکھ لیتے تو ان کا یہ استدلال ان کے دعوے کو ثابت نہیں کرتا کیونکہ حدیث کا مطلب و مقصود یہ ہے کہ وہ جو کچھ قرآن مجید کا حصہ سیکھتے تھے اس سے آگے کا درس اس وقت تک نہیں لیتے تھے جب تک کہ وہ اس کے مراد و مفہوم کو نہ سمجھ لیں۔ اور یہ عام بات ہے۔ اس سے یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مفہوم سیکھتے تھے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ آپ

کے علاوہ اپنے برادر اصحاب سے سیکھ لیتے تھے یا اپنے آپ اس کو جان لیتے تھے جب اللہ تعالیٰ ان پر بھی غور و فکر اور اجتہاد کے دروازے کھول دیتا تھا۔

ان کی تیسری دلیل سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام قرآن مجید کو سمجھتے اور اس کے معانی کی معرفت رکھتے تھے۔ یہ بات کسی بھی کتاب کے بارے میں کہی جا سکتی جس کو کچھ لوگ پڑھتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ وہ قرآن مجید کے ہر ہر لفظ کے حوالے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کیا کرتے تھے۔

چوتھی دلیل بھی ایسی کسی بات پر شہادت نہیں دیتی کیونکہ آیت ربا کی تشریح و تعبیر کرنے سے قبل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے واقعہ کے پیش آجانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ صحابہ کرام کے لیے تمام معانی قرآن بیان فرمایا کرتے تھے۔ غالباً یہ آیت بھی ان مشکل مقامات میں سے تھی جن میں صحابہ کرام کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس آیت کریمہ کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کریم کے دوسرے مشکل مقامات میں سے ایک تھی۔[۴۹]

فریق دوم کے دلائل کا تجزیہ

دوسرے طبقہ نے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے استدلال کیا ہے وہ قطعی باطل ہے کیونکہ مذکورہ بالا حدیث منکر اور غریب ہے۔ وہ محمد بن جعفر زبیری کی روایت ہے اور یہ راوی قابل اعتماد نہیں کیونکہ اس کے بارے میں علماء رجال نے کلام کیا ہے۔ امام بخاری کا فرمان ہے کہ اس کی حدیثوں کی پیروی نہیں کی جائے گی۔ حافظ ابو الفتح ازدی نے اس کو منکر الحدیث (غلط سلط روایات بیان کرنے والا) قرار دیا ہے۔ اس کے بارے میں امام ابن جریر طبری کا بیان ہے کہ اس کا ان لوگوں میں شمار ہے جو اہل کتاب نہیں۔ اور اگر اس حدیث کو صحیح فرض کر لیا جائے تو وہ جیسا کہ علامہ ابو حیان نے کہا ہے تو وہ قرآن مجید کے مغیبات (مشکلات) پر اور اس کے مجمل مقامات کی تفسیر پر اور ایسی ہی چیزوں پر محمول کی جائے گی جن کو جاننے کا ذریعہ سوائے توفیق الٰہی اور عطائے ربانی کے اور کوئی نہیں۔[۵۰] یہی بات امام ابن جریر[۵۱] اور امام ابن عطیہ نے بھی کہی ہے۔[۵۲]

دوسری دلیل بھی تفسیر کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی کسی روایت کی ندرت پر دلالت نہیں کرتی ہے۔ جبکہ دعویٰ یہ ہے کہ تھوڑی سی آیات کے

بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تفسیر بیان فرمائی تھی اور تمام معانی کی تفسیر چونکہ احاطۂ امکان سے باہر تھی اس لیے اس میں آپ کو معذور سمجھا جا سکتا ہے لیکن اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور جو یہ کہا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام آیات کے مفہوم و مراد کو واضح کرنے کا کوئی منصوص حکم نہیں دیا گیا تھا تاکہ لوگ از خود قرآن کریم پر غور و فکر اور تدبر کی عادت ڈالیں تو یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ آپ بیان قرآن و تفسیر فرقان کے لیے بارگاہ الٰہی سے مامور تھے اور چونکہ بہت سی آیات صحابہ کرام کے لیے مشکل و دقیق ثابت ہو سکتی تھیں لہٰذا آپ کے لیے ان کا بیان لازمی ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تمام کا تمام قرآن صحابہ کرام کے لیے مشکل و دشوار ہو جاتا تو بصورت مفروضہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کی ہر ہر آیت کی تفسیر و توضیح لازمی اور ناگزیر ہو جاتی۔ کیونکہ آیت کریمہ: وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (اور تجھ کو اتاری ہم نے یہ یادداشت کہ تو کھول دے لوگوں پاس جو اترا ان کی طرف) کے حکم کے مطابق یہی آپ کا فرض منصبی تھا۔

رہی تیسری دلیل تو اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ وہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے تمام معانی و مطالب کی تفسیر نہیں بیان فرمائی تو ہم اس سے یہ بھی تسلیم نہیں کر سکتے کہ آپ نے صرف نادر مشکلات قرآنی کی تفسیر بیان فرمائی تھی جیسا کہ دعویٰ کیا گیا۔

مسئلہ مذکورہ میں ہمارا نقطۂ نظر

فریقین میں سے ہر ایک کے دعووں کی مبالغہ آرائی اور دلائل کے ذریعہ دعووں کے عدم ثبوت اور دلائل کی کمزوری ثابت ہونے کے بعد جس رائے کی طرف ذہن جاتا اور دل جمتا ہے وہ یہ ہے کہ حقیقت دراصل ان دونوں آرا کے درمیان کہیں مرکوز ہے۔ چنانچہ ہمارا خیال یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے لیے قرآن کریم کی بہت سی آیات کی وضاحت و تفسیر فرمائی تھی۔ جیسا کہ اس پر صحاح کی کتابوں سے شہادت ملتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ آپ نے قرآن کریم کے تمام معانی نہیں بیان فرمائے تھے۔ کیونکہ قرآن کریم میں کچھ حصہ ایسا ہے جس کا علم ذات باری تعالیٰ تک محدود اور اس کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا کچھ حصہ علماء کرام جانتے ہیں اور اس کے کچھ حصہ کو عرب اپنی زبانوں

کی معرفت کے سبب جانتے تھے۔ اور اس کا کچھ حصہ ایسا ہے کہ اس کے نہ جاننے پر کسی کو معذور نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جیسا کہ ابن جریر کی روایت کردہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا " تفسیر کی چار صورتیں ہیں: ایک تفسیر وہ ہے جس کو عرب اپنے کلام و زبان کے سبب جانتے ہیں۔ ایک وہ ہے جس کے نہ جاننے پر کسی کو معذور نہیں سمجھا جا سکتا، ایک وہ تفسیر ہے جس کو علماء جانتے ہیں اور ایک تفسیر ایسی ہے جس کو اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا[۱۱]"

اور یہ بدیہی بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے لیے قرآن کریم کی ان آیات کی تفسیر نہیں بیان فرمائی جس کو کلام عرب کی معرفت سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم ان کی زبان میں نازل ہوا تھا چنانچہ آپ نے ان آیات کی تفسیر نہیں کی جن کی معرفت آسانی سے حاصل ہو جاتی تھی اور یہی وہ آیات قرآن یا حصۂ کلام الٰہی ہے جس کی ناواقفیت پر کسی کو معذور نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ وہ کسی بھی شخص پر مخفی نہیں تھا، اسی طرح آپ نے اس حصہ کی بھی تفسیر نہیں بیان کی جن کے علم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص و محدود کر لیا۔ جیسے قیامت کی آمد و قیام، ارواح کی حقیقت اور ایسے تمام امور جو عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مقبول و محبوب کو بھی مطلع نہیں کیا۔ آپ نے صرف انھیں آیات الٰہی کی تفسیر و تشریح کی جو مغیبات کے ضمن میں آتی ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ نے عوام عرب سے مخفی رکھا تھا مگر اپنے رسول مکرم کو ان سے مطلع کر دیا اور ان کی تفسیر و توضیح کا حکم آپ کو دیا تھا آپ نے صحابہ کرام کے لیے ان آیات کریمہ میں سے بہت بڑی تعداد کی بھی تفسیر بیان کی جو تفسیر کی تیسری قسم کے تحت آتی ہے۔ اور وہ اس حصۂ قرآن سے متعلق ہے جس کو علماء جانتے ہیں اور جو ان کے اجتہاد کی مرہون منت ہے۔ جیسے مجمل کا بیان، عام کی تخصیص، مشکل کی توضیح اور ہر وہ چیز جس کے معنی مخفی اور مراد میں التباس پیدا ہو گیا ہو۔

اس کے بعد سوال کے دوسرے پہلو کا جواب دینا باقی رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اور کس صورت سے بیان فرمائی اس کا جواب ذیل میں دیا جاتا ہے۔

قرآن کریم اور سنت نبوی شریف پر غور کرنے والا ان دونوں میں ایسے شواہد و حقائق پائے گا جو یہ بتاتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کے بیان و تفسیر کے

حوالہ سے اپنا فریضۂ منصبی کماحقہ انجام دیا تھا۔ یا بہ الفاظ دیگر ان میں ایسی شہادت ملتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ قرآن کریم سے سنت نبوی کا تعلق دراصل مُوضِح اور واضح کی گئی چیز کا تعلق ہے یعنی سنت نبوی قرآن مجید کی تفسیر، بیان اور وضاحت پیش کرتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا قول ہے: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (اور تجھ کو اتاری ہم نے یہ یادداشت کہ تو کھول دے لوگوں پاس جو اترا ان کی طرف) اور سنت نبوی میں حضرت مقدام بن معدی کرب کی روایت ہے جسے امام ابوداؤد نے بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: جان لو کہ مجھے کتاب دی گئی اور اس کا مثل بھی اس کے ساتھ عطا ہوا ہے۔ خبردار کوئی پیٹ بھرا (متکبر) شخص اپنے مسند عالی پر بیٹھ کر یہ فتنہ نہ پیدا کرے کہ تمہارے لیے صرف قرآن لازمی ہے اس میں جس چیز کو حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جس کو حرام دیکھو اس کو حرام سمجھو۔ خبردار۔ تمہارے لیے پالتو گدھا (کا گوشت کھانا) حلال نہیں ہے اور نہ ہی درندوں میں سے پنجہ والے جانور حلال ہیں اور نہ کسی معاہد (ذمی) کا لقطہ (گری ہوئی چیز) حلال ہے سوائے اس صورت کے کہ جب اس کے مالک کو اس کی ضرورت و پرواہ نہ ہو اور وہ اس سے مستغنی ہو جائے اور جس طبقہ قوم کے پاس مہمان آئیں اس کے لیے ان کی ضیافت کرنا ضروری ہے لیکن اگر وہ اس کی ضیافت نہ کریں وہ مہمان اپنی ضیافت کے بقدر ان سے حق وصول کر سکتا ہے۔[۴۶]

آپ کے فرمان گرامی کہ "مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مماثل چیز بھی عطا کی گئی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر ایک ایسی وحی نازل ہوئی جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور اس کے جیسا بیان بھی عطا ہوا ہے یعنی یہ کہ آپ کو یہ اذن ہے کہ کتاب کے مشمولات کی وضاحت کریں، اس کے عام و خاص کو بیان کریں، اس پر اضافہ کریں اور کتاب کے احکام و قوانین کو نافذ کریں اور ان سب پر عمل کرنا اور اس کو قبول کرنا اسی طرح واجب و لازم ہے کہ جس طرح قرآن کریم کی ظاہری تلاوت ہے۔ اس کو دوسری طرح سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ آپ کو باطنی وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی بھی اسی طرح عطا ہوئی جس طرح ظاہری وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نجم کی آیات ۳-۴ میں فرمایا ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (اور نہیں بولتا اپنے چاؤ سے۔ یہ تو حکم ہے جو بھیجتا ہے اس کو) آپ کی حدیث مذکورہ بالا جس میں پیٹ بھرے متکبر شخص کے متکبرانہ اعلان کی طرف اشارہ ہے کا مطلب یہ ہے کہ جن سنتوں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رواج

دیا اور جن کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے ان کی مخالفت سے ڈرایا جائے جیسا کہ خوارج اور روافض کا مذہب ہے جنھوں نے ظاہری قرآن کریم سے تو تعلق جوڑا مگر ان سنن رسول کو جو کتاب کی تفسیر وتشریح پر مشتمل ہیں چھوڑ دیا چنانچہ وہ حیرانی وسرگردانی کی وادی میں بھٹکے اور گمراہ ہوئے[۷۶] امام اوزاعی نے حسان بن عطیہ سے روایت کیا ہے کہ وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی تھی اور حضرت جبریل علیہ السلام اس کی سنت بھی لاتے تھے جو اس کی تفسیر کرتی تھی[۷۷] امام اوزاعی کی ایک روایت مکحول سے ہے کہ انھوں نے فرمایا "قرآن مجید کو سنت کی زیادہ ضرورت ہے بمقابلہ سنت کی احتیاج کے جو اسے قرآن کی نسبت سے ہے"[۷۸]

کتاب اللہ کی تفسیر سنت کی صورتیں

جب قرآن کریم، حدیث اور آثار سے یہ واضح ہوگیا کہ سنت کا کتاب سے کیا تعلق ہے اور یہ تعلق واضح کرنے والی چیز کا اس چیز کے واضح کیے جانے سے ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر وبیان کی صورتوں کا ذکر کیا جائے۔ اس کی متعدد وجوہ ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی صورت: قرآن مجید میں مذکور مجمل کا بیان، مشکل کی توضیح، عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید کی جائے۔ ان میں سے پہلی چیز یعنی مجمل کے بیان کی تشریح سنت نبوی وحدیث شریف، پنجگانہ اوقات نماز کی تعیین، نمازوں کی رکعات اور ان کی کیفیات، زکوٰۃ کے نصاب وشرح اور اس کے اوقات وانواع اور حج کے مناسک کا بیان شامل ہے۔ اسی لیے آپ نے فرمایا تھا: "مجھ سے اپنے مناسک سیکھ لو۔" آپ کا یہ بھی فرمان ہے "اس طرح نماز پڑھا کرو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔"

امام عبداللہ بن مبارک حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک شخص سے کہا: بلاشبہ تم ایک احمق آدمی ہو۔ کیا تم اللہ کی کتاب میں ظہر کی چار رکعتوں کا بیان پاتے ہو جن میں قراءت جہری نہیں ہوتی؟ پھر اس کے سامنے نماز اور زکوٰۃ اور اسی جیسی چیزوں کو گنایا اور پھر فرمایا: کیا تم ان چیزوں کو کتاب اللہ میں مفصل ومفسر بیان کیا ہوا پاتے ہو؟ اللہ تعالیٰ کی کتاب نے ان چیزوں کو مبہم رکھا ہے اور بلاریب سنت ان کی تفسیر بیان کرتی ہے"[۷۹]

دوسری چیز کی مثال اللہ تعالیٰ کے قول: حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ[۸۰] (جب تک صاف نظر آوے تم دھاری سفید جدا دھاری سیاہ سے فجر کی) میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر ہے جو آپ نے سفید وسیاہ دھاگے

کی وضاحت کی اس سے مراد دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے۔

تیسری چیز کی مثال اللہ تعالیٰ کے فرمان: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ[۵۰] (جو لوگ ایمان لائے اور ملائی نہیں اپنے یقین میں کچھ تقصیر) میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظلم کا شرک کے ساتھ مخصوص کرنا ہے۔ کیونکہ بعض صحابہ نے اس سے عام ظلم مراد لیا تھا حتیٰ کہ یہ کہا تھا کہ ہم میں سے کس نے اپنے آپ پر ظلم نہیں کیا؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا تھا کہ اس سے وہ مراد نہیں بلکہ شرک مراد ہے۔

اور چوتھی چیز کی مثال اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا[۵۱] (تو کاٹ ڈالو ان کے ہاتھ) ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ہاتھ سے داہنا ہاتھ (یمین) مراد بتایا ہے۔

دوسری صورت

کسی لفظ کے معنی یا اس سے متعلق چیز کا بیان جیسے "مغضوب علیہم" سے یہود اور "الضالین" سے نصاریٰ کا مراد ہونا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول: وَلَھُمْ فِیْھَآ اَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَۃٌ[۵۲] (اور ان کو ہیں وہاں عورتیں ستھری) کی یہ تفسیر وہ حیض، تھوک اور بلغم سے پاک ہوں گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّۃٌ نَّغْفِرْ لَکُمْ خَطٰیٰکُمْ وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ۔ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَھُمْ[۵۳] (اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کر کر اور کہو گناہ اترے تو بخشیں ہم تقصیریں تمہاری اور زیادہ بھی دیں گے نیکی کرنے والوں کو۔ پھر بدل لی بے انصافوں نے اور بات سوائے اس کے جو کہہ دی تھی) کی یہ تشریح کہ وہ اپنے سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور کہتے تھے: "جو میں دانہ ہے۔"

تیسری صورت

قرآن مجید میں جو احکام و قوانین وارد ہوئے ہیں ان پر مزید اضافہ اور تشریح۔ مثال کے طور پر پھوپھی اور خالہ کی موجودگی میں ان کی بھتیجیوں یا بھانجیوں سے نکاح کی حرمت، صدقہ فطر کا وجوب، شادی شدہ زانی کی سنگساری، دادی کا حق وراثت، گواہ اور قسم پر فیصلہ وغیرہ اس قسم کی بہت سی چیزیں فروعات کی کتابوں میں مذکور ہیں اور جن کی قانون سازی سنتِ نبوی نے کی ہے۔

چوتھی صورت

نسخ کا بیان۔ یعنی یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اس آیت نے اس

آیت کو منسوخ کر دیا ہے یا اس حکم نے اس حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ چنانچہ آپ کا فرمان ہے: "وارث کے لیے وصیت کی گنجائش نہیں ہے"۔ اس سے مراد آپ کی یہ وضاحت ہے کہ وصیت کی آیت والدین اور رشتہ داروں کے حکم میں منسوخ ہے اگرچہ اس کی تلاوت باقی رکھی گئی ہے۔ اور یہ حدیث کہ "اگر ایک کنواری سے ایک کنوارا زنا کرے تو ان کے لیے سو کوڑوں اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا ہے" دراصل سورہ نساء کی آیت ۱۵: وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ.... (اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں تو شاہد لاؤ ان پر چار مرد اپنے) کے حکم کو منسوخ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں اس نوع کی ہیں۔

پانچویں صورت

تاکید کی تشریح - اس کا مطلب یہ ہے کہ **سنت کتاب اللہ** کے احکامات کی موافقت و تاکید کرتی ہے۔ اور اس سے حکم الٰہی کی تاکید و تقویت مقصود ہوتی ہے۔ اس کی مثال آپ کا قول ہے: "کسی مسلمان شخص کا مال دوسرے کے لیے حلال نہیں جب تک اس کی رضا شامل نہ ہو"۔ یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے فرمان: لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ (نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق) کی تائید و موافقت کرتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہا کرو۔ وہ تمہارے ہاتھوں میں بارش شدہ زمین کی مانند ہیں۔ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے بطور حاصل کیا ہے اور اللہ کے کلمہ کے سبب ان کی شرمگاہوں کو حلال کیا ہے"۔ یہ حدیث نبوی اللہ تعالیٰ کے فرمان وعاشروھن بالمعروف (اور گذران کرو عورتوں کے ساتھ معقول) کے ساتھ موافقت رکھتی ہے۔

بقیہ: حکمتِ اقبال

...نے کے بعد ان کو سچ مچ کی علمی حقیقتیں بنایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اوپر کی مثال میں دوسرا نقاش فنکار پہلے فنکار کے نامکمل خاکہ یا اس کی نامکمل تصویر کو صرف اسی صورت میں مکمل کر سکے گا کہ وہ پہلے فنکار کے وجدانی تصورِ حسن سے پوری طرح واقف ہو چکا ہو۔ (جاری ہے)